michel bernanos
THE OTHER SIDE OF THE MOUNTAIN
SPHERE SCIENCE FICTION
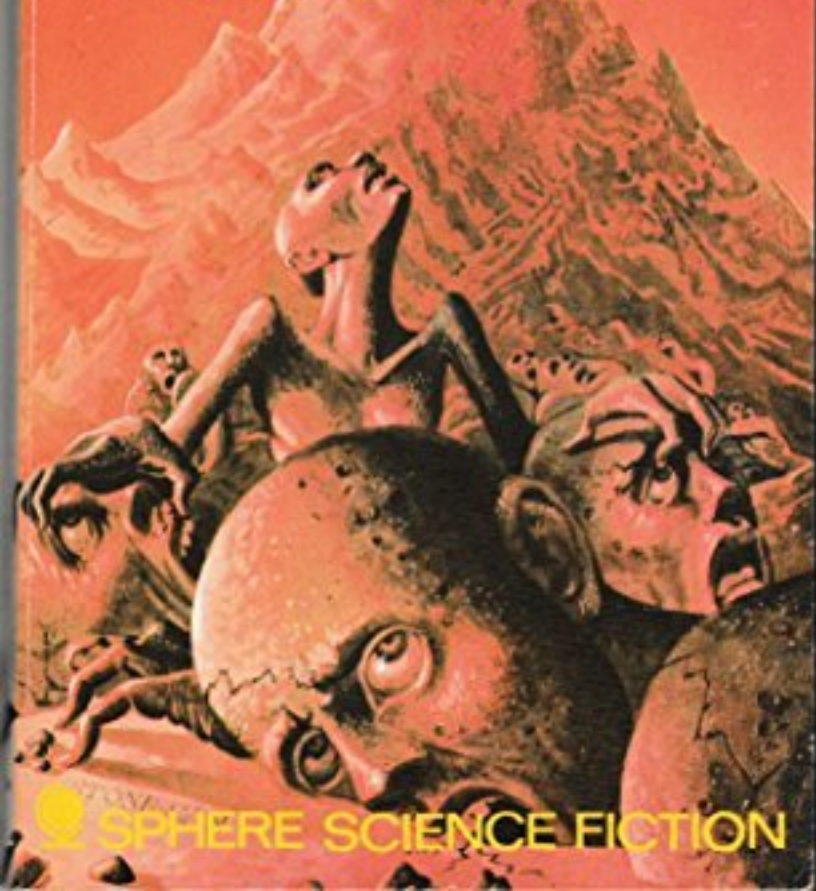
میچل برنانوس
تلخیص، محمد شریف کیانی
پتھر کے اِنسان
جرأت اور مُہم جُوئی کی ایک ایسی داستان
جو قدم قدم پر چونکا دینے
والے پُراسرار واقعات سے گزرتی ہے اور ایک
طلسماتی دُنیا میں لے آتی ہے۔

ہولناک سفر کی ابتدا کیسے ہوئی؟ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔

اس دن میری اٹھارویں سالگرہ تھی۔ شام کے وقت ایک دوست کے ساتھ 'بار' میں پہنچا۔ وہاں خوب شراب اڑائی اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ صبح ہوش آیا تو کھردرے چوبی تختوں پر لیٹا تھا۔ لیٹے لیٹے گردن گھمائی تو رسیوں کے پہاڑ دکھائی دیے۔ داہنی طرف موٹے موٹے رسوں کے پیپے ہی ڈھیر لگے تھے جو میں ساحل پر لنگر انداز جہازوں کے عرشوں پر اکثر دیکھ چکا تھا۔ پھر بڑے بڑے پھڑپھڑاتے ہوئے بادبان نظر آئے اور میرا شک یقین میں بدل گیا کہ میں بحری جہاز کے عرشے پر پڑا ہوں۔ چاروں طرف تاحدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔ حیرت اور خوف کے مارے دل بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا یہاں تک کیسے پہنچا۔

معاً قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہوں، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے کسی نے پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھر نہایت کرخت لہجے میں حکم دیا: "اٹھو کیبن بوائے! ہمیں عرشے کی صفائی کرنی ہے۔" اپنی بات ختم کر کے اس نے ایک اور ٹھوکر ماری۔ میں درد سے بلبلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی لڑکھڑاتے ہوئے سیدھا کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوبارہ حکم ملا: "باورچی کے پاس جا کر کھانا پکانے میں اس کی مدد کرو۔"

مجھے کچھ معلوم نہ تھا باورچی خانہ کہاں ہے۔ خاموش کھڑا ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ مخاطب جو شاید میٹ تھا، اس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ غصے میں چہرے کے سیاہ اور بھدے نقوش اور بھیانک ہو گئے۔ پیر پٹختے ہوئے گلا پھاڑ کر چیخا: "اچھا تو تم میرا حکم ماننے سے انکار کرتے ہو۔" پھر قریب کھڑے ہوئے دوسرے ملاحوں کی طرف دیکھ کر بولا: "ذرا رسا تو لانا۔ دیکھوں یہ چھوکرا میرا حکم کیسے نہیں مانتا۔"

میں بزدلوں کی طرح کھڑا ان کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ دو ملاح رسا لے آئے جس کے سرے پر کچھ وزن بندھا تھا۔ اسے میری کمر کے گرد لپیٹ دیا گیا۔ پھر کئی لوگوں نے پکڑ کر مجھے اوپر اٹھایا، پھر نیچے سمندر میں لٹکایا اور رسا آہستہ آہستہ گرانا شروع کیا۔ سمندر متلاطم تھا۔ جھاگ اڑاتی غضبناک لہریں بار بار جہاز سے ٹکراتیں۔ یہ منظر دیکھ کر فرطِ خوف سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں لیکن سنگدل ملاحوں کا دل ذرا نہ پسیجا۔ مجھے خوفزدہ اور بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ان کے زور زور سے قہقہے لگنے لگے۔ میں نے جہاز کے چوبی ڈھانچے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ انگلیاں بری طرح زخمی ہو گئیں لیکن اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سال خوردہ اور نم آلود ڈھانچہ بار بار ہاتھوں سے پھسل جاتا۔ مایوس ہو کر میں نے خود کو قسمت کے سپرد کر دیا۔

رسی آہستہ آہستہ نیچے کھسک رہی تھی۔ میرا اور پانی کا درمیانی فاصلہ تیزی سے سمٹنے لگا۔ معاً میرا ایک پاؤں پانی سے ٹکرایا۔ میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بھینچ لیں اور جسم اکڑا لیا۔ پانی جب ٹھوڑی تک پہنچا تو میں نے گہرا سانس لیا اور پھیپھڑوں میں اچھی طرح ہوا بھر لی۔ خیال تھا پانی میں ڈوبنے کے بعد دیر تک سانس روکے رکھوں گا مگر بے سود۔ نابکار ملاحوں نے رسی کھینچ کر دو تین جھٹکے دیے۔ میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور دم گھٹنے لگا۔ سانس لینے کے لیے مجبوراً منہ کھولا لیکن سمندری پانی ناک اور منہ میں بھر گیا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ اب جو منظر دیکھا، اس سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سر کے عین اوپر جہاز کا پیندا نظر آ رہا تھا جس پر کائی کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ زیرِ آب ملگجی روشنی میں اچانک یوں محسوس ہوا جیسے جہاز کے ڈھانچے نے ہولناک عفریت کا روپ دھار لیا ہو اور مجھے ہڑپ کرنے کے لیے منہ کھول رہا ہو۔ چند لمحے بعد آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی اور ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو خود کو ایک جھولے نما بستر میں پڑا پایا۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی دیکھ کر اندازہ ہوا رات ہو چکی ہے۔ چند فٹ کے فاصلے پر ایک ستول کے ساتھ لالٹین بندھی جھول رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں میں نے ایک جھریوں بھرا چہرا اپنے اوپر جھکے دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اگرچہ رحم اور شفقت مفقود تھی لیکن ان میں عیاری اور خباثت کی جھلک بھی نہ تھی۔ مجھے آنکھیں جھپکتے دیکھ کر اس نے کہا: "آخر تمہیں ہوش آ ہی گیا لڑکے! اٹھو، کھانا کھا لو۔ زیادہ دیر تک خالی پیٹ رہنا ٹھیک نہیں۔ تین دن بعد ہوش آیا ہے۔ قسمت اچھی تھی۔ شور سن کر کپتان موقع پر پہنچ گیا اور تمہیں باہر نکال لیا گیا، ورنہ ملاحوں نے تمہاری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اب جلدی سے اٹھ بیٹھو۔ مجھے باورچی خانے میں ایک معاون کی ضرورت ہے، تم میرے ساتھ رہو گے۔"

"میں جہاز میں کیسے پہنچا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ارے تمہیں یاد نہیں رہا۔ تم نے ایک چھپے ہوئے فارم پر دستخط کر کے سال بھر کا معاہدہ کیا ہے۔ تمہارے ساتھ ایک دوست تھا لیکن وہ تمہیں کپتان کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔"

دوست کا ذکر سنا تو مجھے اچانک سالگرہ کی شام یاد آ گئی۔ فوراً سمجھ گیا رقم کے لالچ میں حرام خور دوست مجھے جہاز پر چھوڑ گیا اور ان لوگوں نے نشے کے عالم میں مجھ سے معاہدے پر دستخط کروا لیے۔ اب کیا ہو سکتا تھا

خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بوڑھا ملاح میری ذہنی کیفیت سے بے خبر بدستور اپنی کہے جا رہا تھا: "ہم سونے کی تلاش میں پیرو جا رہے ہیں۔ انگریزوں یا ولندیزیوں سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تو شاید منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں۔" پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور باورچی خانے میں لے آیا جہاں ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے کیڑے مکوڑے بکثرت موجود تھے۔ بوڑھے باورچی کا نام ٹونی تھا۔ اس نے خوش ذائقہ شوربے اور ڈبل روٹی سے میری تواضع کی اور پھر دوبارہ ایک جھولے نما بستر میں سلا دیا۔

میں ٹونی کے ساتھ جلد ہی گھل مل گیا۔ وہ باتونی، اکھڑ اور بددماغ ضرور تھا لیکن دوسروں کی طرح سنگدل اور سفاک نہ تھا۔ میرا اچھی طرح خیال رکھتا۔ ایک مرتبہ کچھ ملاحوں نے مجھے دوبارہ تنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے چاقو نکال لیا اور ان کے مقابلے میں آ گیا۔ ملاحوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انہیں کان ہو گئے۔ اس کے بعد پھر کسی نے مجھے دِق کرنے کی جرأت نہ کی اور میں مزے سے ٹونی کے ساتھ باورچی خانے میں دن کاٹنے لگا۔

ایک صبح بیدار ہوا تو خلافِ معمول چاروں طرف گہرا سکوت تھا۔ ٹونی ابھی تک سو رہا تھا۔ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بستر سے کود کر چیخا: "رک گئی، کم بخت رک گئی۔" پھر مجھے جاگتا دیکھ کر بولا: "تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے؟" میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا: "نہیں، مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔ کیا شے ہے؟"

"آہ! کم بخت، بُرے پھنسے۔ ہوا رک گئی۔ ہم اس وقت سمندر کے ایسے حصے میں ہیں جہاں پانی بالکل ساکن رہتا ہے اور یہ کیفیت دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں برقرار رہتی ہے۔"

ٹونی کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جہاز ایک ہی مقام پر یوں ساکن کھڑا تھا جیسے لنگر ڈال رکھا ہو۔ ہم آٹھ دن تک ہوا کے چلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن مراد بر نہ آئی۔ گرمی روز بروز ناقابلِ برداشت ہونے لگی اور ملاحوں میں بے چینی کے آثار پھیلنے لگے۔ نہ جانے یہ گرمی کا اثر تھا یا خوراک اور پانی کی کمی کا نتیجہ کہ سب کے ہونٹ اور مسوڑھے زخمی ہو کر بری طرح سوج گئے۔ کپتان نے اس مصیبت کا مداوا کرنے کے لیے رم تقسیم کرنے کا حکم دیا جس کا ان کے پاس خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ اس قیمتی شراب کے بدلے میں پیرو کے جنگلی قبائل سے سونا حاصل کیا جاتا تھا۔ رم کا ذخیرہ گھٹنا شروع ہوا تو اس کی تقسیم روک دی گئی۔

چالیسویں دن ٹماٹروں میں سڑاند پیدا ہو گئی۔ یہ واحد غذا تھی جو اب تک گلنے سڑنے سے محفوظ رہی تھی۔ تعفن ناقابلِ برداشت ہو گیا تو کپتان نے فیصلہ کیا سارے ٹماٹر سمندر میں پھینک کر ضائع کر دیے جائیں لیکن چند ملاح آڑے آ گئے۔ انہوں نے شور مچایا کسی قسم کی غذا بالکل نہ ہونے سے گلے سڑے ٹماٹر اچھے ہیں۔ کچھ دن تو پیٹ کا جہنم بھرا جا سکتا ہے۔ کپتان نے لاکھ کہا بیماری پھیل جائے گی مگر انہوں نے پھینکنے نہ دیے۔ آخر اسے اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ جو ملاح بھوک کے ہاتھوں زیادہ پریشان تھے وہ گلے سڑے بدبودار ٹماٹروں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں دھوئے یا پکائے بغیر کھانے لگے۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور انہوں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی۔ اس منظر سے باقی ملاح دہشت زدہ ہو کر رہ گئے۔ کپتان نے سب کے سامنے ساری بوریاں سمندر میں پھنکوا دیں۔ کسی نے کوئی احتجاج یا مزاحمت نہ کی۔

ٹونی نے آٹے کی ایک بوری چھپا کر رکھ چھوڑی تھی۔ ہم دونوں روزانہ چپکے سے اپنا پیٹ بھر لیتے۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے کوشش کی دوسروں کو بھی کھانے میں شریک کر لیا جائے۔ ٹونی نے سختی سے ڈانٹا: "خبردار! اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ایک بوری سے ہم سب کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ وہ منظر بھول گئے جب ان سؤر کے بچوں نے تمہیں رسی سے باندھ کر سمندر میں لٹکا دیا تھا۔" میں نے چپ سادھ لی۔

جہاز کو رکے پینتالیس دن ہو رہے تھے۔ پچھلے تین روز سے عرشے پر کسی کو پانی نصیب ہوا تھا نہ خوراک۔ بھوک اور پیاس کے مارے سب پاگل ہو رہے تھے۔ کپتان کو رم کے ذخیرے کی بہت فکر تھی۔ اس نے اس کی حفاظت کے کڑے انتظامات کر رکھے تھے لیکن ایک رات ملاح کلہاڑیوں، لاٹھیوں سے مسلح ہو کر چیختے چلاتے ذخیرے پر ٹوٹ پڑے اور شراب کے پیپے عرشے پر اٹھا لائے۔ ٹونی اور میں باورچی خانے کے روشندان سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ان کے چہرے بھیانک نظر آتے تھے۔ کمزوری سے آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور صرف دو خالی سوراخ دکھائی دیتے۔

شراب پی کر انہوں نے اودھم مچانا شروع کر دیا۔ چند نے خنجر نکال لیے اور دوسرے ساتھیوں کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ ٹونی نے باورچی خانے کا دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا اور بولا: "آج رات ضرور کوئی نہ کوئی حادثہ ہو کر رہے گا۔ ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

معاً کپتان کی آواز سنائی دی۔ ہم دوبارہ روشندان کے قریب پہنچے اور باہر جھانکنے لگے۔ شراب میں بدمست ملاح چاقو لہراتے باقاعدہ ایک دائرے

کے خلاف صف آرا تھے۔ نشے کی زیادتی اور نقاہت کی وجہ سے اُنہیں اپنے آپ کو سنبھالنا دُشوار ہو رہا تھا۔ شور سُن کر کپتان اپنے کیبن سے نکل آیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ اس نے اُنہیں ڈانٹا اور خاموش بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ ملّاح ٹھٹک گئے، لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ ایک نے اچانک بڑی چابکدستی سے چاقو پھینکا جو کپتان کے گلے میں ترازو ہو گیا اور خون کا فوّارا اُبل پڑا۔ کپتان لڑکھڑایا تاہم دونوں پستولوں کے ٹریگر دبا دیے اور بے دم ہو کر گر پڑا۔ ایک گولی ایک ملّاح کے پیٹ میں لگی، اور وہ چیختا ہُوا عرشے پر ڈھیر ہو گیا۔

خون دیکھ کر ملّاحوں پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اُنھوں نے کپتان کو پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ قریب تھا اُسے سمندر میں پھینک دیتے کہ ایک آواز اُبھری: "پھینکو مت! اسے کھا جاؤ، بڑے مزے کا گوشت ہوگا۔"

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے، پھر پاگلوں کی طرح کپتان کی لاش پر ٹوٹ پڑے اور پلک جھپکتے میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ کپتان کا گوشت کھانے کے بعد ان وحشیوں کی بھوک اور تیز ہو گئی، وہ اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ ہُوئے۔ اُن کی بھُوکی نظروں کی تاب نہ لاکر وہ بیچارا چیخنے چلّانے اور رحم، رحم پکارنے لگا مگر کسی نے نہ سُنی، کئی طاقتور ہاتھوں نے اُسے زبردستی پکڑ لیا اور جیتے جاگتے کے جیتے بخرے کر دیے۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر میں لرز اُٹھا۔ کراہت سے جی متلانے لگا، چنانچہ روشندان بند کر کے پیچھے ہٹ آیا۔

اگلے دن میں دوپہر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھُلی تو گزشتہ رات کا دہشت ناک منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس جہنّم سے باہر نکلنے کی کوئی صُورت نہ تھی۔ سوچا اب جلد یا بدیر میری باری آئے گی اور یہ وحشی مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے —— بے اختیار جھُرجھُری سی آگئی اور مُنہ سے ایک آہ نکلی۔ ٹونی روشندان سے چپکا کھڑا تھا، میں بھی اُٹھ کر دوسرے روشندان سے جا لگا۔

ملّاح پھر شغلِ مے نوشی میں مصروف تھے۔ انسان کے گوشت اور شراب نے اُن کے معدے میں انگارے سے بھر دیے تھے۔ وہ اس کی تلخی کم کرنے کے لیے شراب کا سہارا لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر پیاس کی شدّت اور معدے کی اینٹھن کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جاتی تھی۔ پھر وہ درد سے بے تاب ہو کر بل کھانے اور جانوروں کی طرح چیخنے لگے۔ کئی ملّاحوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ٹونی دیر سے خاموش تھا۔ اچانک میرا کندھا تھپتھپاتے ہُوئے بولا: "دیکھا لڑکے! انسان پاگل ہو جائے تو اس کی حالت باؤلے کتّے سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ ان کے مُنہ کو خُون لگ چکا ہے۔ اس وقت پیٹ بھرا ہُوا ہے، اس لیے بس ہیجانِ دماغ میں مصروف ہیں، تھوڑی دیر بعد بھُوک ستائے گی تو یہ بچے کھُچے وحشی دوبارہ ایک دُوسرے کو چیرنے پھاڑنے پر اُتر آئیں گے۔ خدا جانے یہ کم بخت ہوا کب چلے گی!"

وحشی ملّاح کسی وقت بھی ہم پر اچانک حملہ کر سکتے تھے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر ہم نے باورچی خانے کا دروازہ، کھڑکیاں اور روشندان سب بند کر رکھے تھے۔ دوپہر کے وقت گرمی کی شدّت اور گھٹن ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ ٹونی نے اُٹھ کر ایک کھڑکی کھول دی۔ عرشہ ویران پڑا تھا۔ آفتاب کی تمازت سے گھبرا کر ملّاحوں نے سائے میں پناہ لے رکھی تھی۔ کپتان کی ہڈیاں بدستور عرشے پر پڑی تھیں۔ دھُوپ سے اُن کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور بدبُو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ کھڑکی کھُلی تو سانس لینا دشوار ہو گیا، مگر ٹونی سے برداشت نہ ہو سکا۔ بالٹی لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا: "ایک آدھ گھنٹے تک یہی حالت رہی تو اس تعفّن سے ہمارا دماغ پھٹ جائے گا اور ہم بھی پاگل ہو جائیں گے۔ میں باہر جا کر عرشہ صاف کرتا ہُوں۔" دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے ایک پستول اور خنجر کمر بند میں باندھ لیا۔ میں نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ بڑی مشکل سے مانا اور ایک بھرا ہُوا پستول میرے حوالے کر دیا۔

باہر شدید گرمی تھی۔ عرشہ بُری طرح تپ رہا تھا۔ ہمارے پاؤں جھُلس گئے، لیکن ہم نے کوئی پرواہ نہ کی۔ بالٹیوں سے پانی کھینچے اور عرشے پر اُنڈیلنے لگے۔ ٹونی نے خون کے سُرخ دھبّے صاف کر دیے، پھر ہڈیاں اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کو تھا کہ گودام کے دروازے میں بیٹھا ہُوا ایک ملّاح دھاڑا: "خبردار! اسے ہاتھ نہ لگانا، یہ میرا کھانا ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ ایک آہنی سلاخ لہراتا ہُوا ٹونی کو مارنے کے لیے لپکا۔

ٹونی اس اچانک حملے سے گھبرا گیا۔ اُسے پستول نکالنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ میں نے فوراً اپنا پستول نکالا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، داغ دیا —— گولی پاگل حملہ آور کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہُوئی دوسری طرف نکل گئی اور وہ کسی قسم کی آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ٹونی پکارا: "شاباش بہادر لڑکے! اگر تم نہ ہوتے تو یہ خبیث یقیناً میری کھوپڑی پاش پاش کر دیتا اور پھر میری لاش پر ضیافت اڑاتا۔ چلو اسے اٹھا کر پانی میں پھینک دیں۔ دُوسروں کو خبر ہو گئی تو اسے بھی کھانے بیٹھ جائیں گے۔"

ہم دونوں نے مل کر لاش پانی میں پھینک دی اور خاموشی سے

باورچی خانے میں واپس آ گئے جہاں باہر کی نسبت بڑی حد تک ٹھنڈک اور سکون تھا۔ پھر ہم نے دروازہ اور روشندان بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

اُچھل کود اور کھانے پینے کے بے ہنگم شور سے آنکھ کھُلی تو رات ہو چکی تھی۔ ٹونی نے احتیاطاً لالٹین نہ جلائی، خطرہ تھا روشنی دیکھ کر وحشی ٹولا ہماری طرف متوجّہ نہ ہو جائے۔ روشندان سے باہر جھانکا تو ملّاح ایک پیپے کے گرد بیٹھے جام پر جام لُنڈھاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہُوئے اُنہیں بڑی حسرت سے دیکھا۔ ہمارا پانی اور آٹے کا ذخیرہ چند دن ہُوئے ختم ہو چکا تھا اور اب بھُوک پیاس سے میرا بُرا حال تھا۔ زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ جلد ہی واپس اپنے بستر پر جا کر لیٹ رہا۔ ٹونی سے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ اُس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وہ میری مدد کرتا بھی تو کیا؟

رات بھیانک خواب دیکھتے کٹی۔ صبح سویرے چھت پر اچانک ٹپ... ٹپ کی آوازیں سُنائی دیں جیسے سینکڑوں بطخیں چوبی تختے پر زور زور سے پنجے مار رہی ہوں۔ ٹونی لمحہ بھر کے لیے کان لگائے بغور سنتا رہا، پھر بستر سے کُودا اور خوشی سے ناچتے ہُوئے بولا: "بارش، لڑکے! بارش!"

اُس نے بڑی پھُرتی سے دروازہ کھولا۔ ہم دونوں باہر نکل کر عرشے پر چت لیٹ گئے اور پاگلوں کی طرح منہ کھول کر بارش کے قطروں سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ اُس وقت خونخوار ملّاحوں سے ہمیں ذرا خوف نہ آیا۔

ہماری طرح ملّاح بھی بارش سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ پیاس بجھانے کے بعد اُنھوں نے بادبان پھیلانے شروع کر دیے۔ افراد کی کمی اور نقاہت کی وجہ سے انہیں بڑی دِقّت پیش آ رہی تھی۔ ٹونی تھوڑی دیر تک خاموشی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر نہ رہ سکا اور اُٹھ کر اُن کا ہاتھ بٹانے لگا۔ موسم ٹھیک ہونے کی خوشی میں وہ اپنے اختلافات بھلا کر اُن کے ساتھ گھُل مل گیا۔ مجھے بادلِ نخواستہ اُس کی تقلید کرنا پڑی۔

آدھ گھنٹے بعد بارش رُک گئی اور ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ دلوں میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے دیوانہ وار ناچنا شروع کر دیا۔ اچانک ٹونی نے میرا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتے ہُوئے کہا: "اتنی خوشی کس بات کی! مصیبت ختم تو نہیں ہُوئی۔ ابھی ہمیں جہاز ٹھیک راستے پر ڈالنا ہے۔ آؤ، پہلے انجن روم میں چل کر دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

انجن رُوم میں میٹ پہلے سے موجود تھا۔ اُس نے اپنے سامنے میز پر نقشے پھیلا رکھے تھے۔ ہم اندر داخل ہُوئے تو اُس نے سر اٹھایا اور حیرت بھری نظروں سے ہمیں تکنے لگا۔ ٹونی بولا: "آہ! خدا کپتان کی حالتِ زار پر رحم کرے!" اُس کا لہجہ بُجھا بُجھا تھا۔ میٹ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "اور تمہاری حالتِ زار پر بھی۔" اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

پھر میٹ نے خاموشی توڑتے ہُوئے کہا: "تم کپتان کے ساتھ طویل عرصے تک ان سمندروں میں سفر کر چکے ہو۔ جانتے ہو وہ جہاز رانی کے آلات اور نقشے کہاں رکھتا تھا؟" اس مرتبہ خلافِ توقّع اس کا لہجہ نرم اور خوشامدانہ تھا۔

"نقشے پر اس مقام کی نشاندہی تو کرو جہاں ہم اِس وقت موجود ہیں؟"

"کیسے نشاندہی کروں؟" میٹ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: "مجھے ان نقشوں کے سوا کوئی چیز نہیں ملی اور یہ نقشے بھی بالکل نئے ہیں۔ آلات کے بغیر جہاز کا محلِ وقوع کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"ستاروں کی مدد سے۔"

"واہ! بہت اچھے۔" میٹ ٹونی کی آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے بڑے تمسخر سے بولا: "اس ملعون جہاز پر ستاروں کا علم کسے آتا ہے؟"

"میں تمہاری رہنمائی کر سکتا ہُوں۔" ٹونی کا جواب سُن کر میٹ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ دوبارہ بلند آواز میں استفسار کیا۔ ٹونی دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے بڑے آرام سے تمباکو چبا رہا تھا، بے نیازی سے بولا: "میں ستاروں کی مدد سے سمت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ میرے بغیر تم کبھی اپنی منزل نہ پا سکو گے۔ تمہاری مدد کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن ایک شرط ہے۔ میں اس جہاز کا کپتان ہُوں گا۔"

"کپتان... تم؟" یہ انوکھی شرط سُن کر میٹ حیرت سے اُچھل پڑا۔ مُٹھیاں بھنچ گئیں اور پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، کہیں مار پیٹ تک نوبت نہ پہنچ جائے، لیکن ٹونی اس کی کمزوری سے آگاہ ہو چکا تھا، پہلے کی طرح پُرسکون اور بے نیاز کھڑا رہا۔ اُسے میٹ کے غصّے کی ذرا پروا نہ تھی۔ میٹ چند سیکنڈ تو اُسے خاموشی سے گھُورتا رہا، پھر غصّہ ضبط کرتے ہُوئے بڑی تلخی سے بولا: "ٹونی! تمہارا دماغ ٹھیک ہے یا نہیں؟"

"میرا دماغ ٹھیک ہو یا خراب، اس سے تمہیں کیا غرض! جاؤ، دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کر لو۔ اس وقت جہاز ایک گول دائرے کی صُورت میں چکّر کاٹ رہا ہے۔ میری مدد کے بغیر تم یہاں سے نہ نکل سکو گے۔ تم میرا نائب بننا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

میٹ نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا، لیکن ٹونی کو بے تعلّق دیکھ کر

خاموشی اختیار کرلی اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ٹونی کہنے لگا: "پہلا مرحلہ بخیر وخوبی طے ہوگیا۔ ستاروں کا علم کس کم بخت کو آتا ہے! خاموشی سے دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم جلد ہی کسی نہ کسی بہانے اُن سے ہتھیار بھی اکٹھے کرلیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد میٹ واپس آگیا اور دُور ہی سے چلّایا:

"ٹھیک ہے چیف! میرے ساتھیوں نے تمہیں کپتان چُن لیا لیکن انہیں صرف ایک نائب مقرر کرنے پر اعتراض ہے!"

"اعتراض..." ٹونی نے تلخ کلامی کرتے ہوئے کہا: "انہیں بتا دو مجھے کپتان چُن لیا ہے تو پھر میرا حکم چلے گا۔ میں دُوسروں سے مشورہ لینے کا عادی نہیں۔"

یہ غیر متوقع جواب پاکر میٹ کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ چُپ چاپ سر جھکائے چلا گیا۔

اس اثنا میں ہوا کے جھونکوں میں بتدریج تیزی پیدا ہوگئی تھی اور جہاز خطرناک حد تک ایک طرف جھکتا جا رہا تھا لیکن کسی کو موقع کی نزاکت اور سنگینی کا احساس تک نہ تھا۔ ٹونی چند لمحے چُپ چاپ کھڑا کچھ سوچتا رہا — پھر میگافون کے ساتھ مُنہ لگا کر چلّاتے ہوئے حکم دیا: "مرکزی بادبان لپیٹ دو۔"

عرشے پر موجود ملّاح پہلے تو ہچکچائے لیکن آخر حکم مان لیا اور اس طرح ٹونی خود بخود کپتان بن بیٹھا حالانکہ اُسے جہاز رانی کی کچھ شُدبُد نہ تھی۔

دن بخیریت گزر گیا۔ رات آئی۔ ٹونی نے اندازے سے ایک روشن ستارہ منتخب کیا اور جہاز اس کی سیدھ میں سفر کرنے لگا۔ ہم دونوں نے وہ رات کپتان کے خوبصورت کشادہ اور آرام دہ کیبن میں بسر کی۔

صُبح آنکھ کھُلی تو کیبن میں مَیں تنہا تھا۔ ٹونی کا بستر خالی پڑا تھا۔ جہاز بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا — روشندان سے جھانکا تو چاروں طرف غضبناک لہریں جھاگ اُڑاتی نظر آئیں۔ ہم طوفان میں گھر چکے تھے۔ مَیں انجن رُوم کی طرف لپکا۔ خیال تھا ٹونی وہیں ہوگا۔

عرشے کا دروازہ بڑی مضبوطی سے بند تھا۔ اُسے کھولنے کے لیے خاصی دیر تک زور آزمائی کرنی پڑی۔ باہر نکلا تو اچانک ایک زبردست لہر جہاز سے ٹکرائی۔ جہاز نے ہچکولا کھایا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر گرا اور دُور تک پانی کے ساتھ بہتا چلا گیا۔ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور بھاگ کر انجن رُوم پہنچا۔ ٹونی وہاں نہ تھا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ آخر وہ عرشے پر جہاز کا وہیل سنبھالے نظر آیا۔

ہوا کے تیز و تُند تھپیڑوں کے آگے جہاز بے بس تنکے کی مانند ڈول رہا تھا۔ منہ زور لہریں بار بار عرشے پر یلغار کر رہی تھیں۔ ٹونی تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ میں نے دس بارہ مرتبہ کوشش کی، لیکن ہر بار راستے میں پانی کی دیوار کھڑی ہو جاتی اور مَیں ڈر کر پیچھے ہٹ آتا۔ ٹونی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن ہوا اور لہروں کے شور میں اُس کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور ٹونی تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھی۔ آخر ایک مہیب لہر نے میرے پاؤں اکھاڑ دیے اور مجھے اُچھال کر اُس کے قریب لا پھینکا۔ ٹونی نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مَیں سمندر میں گرنے سے بال بال بچا۔ تھوڑی دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو ٹونی بولا: "لڑکے! تم خوب وقت پر آئے۔ اس طوفانی موسم میں وہیل کو تھامے رکھنا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔"

ہوا چنگھاڑ رہی تھی اور بپھرے ہوئے سمندر کے غصّے میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مرکزی مستول زیادہ دیر تک ہوا کا زبردست دباؤ برداشت نہ کر سکا۔ اچانک ٹوٹ کر گرا۔ ہم دونوں وہیل سے چمٹے کھڑے تھے، لیکن وہ بار بار ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا اور جہاز کا توازن برقرار نہ رہتا۔ ایک گھنٹے بعد میٹ کی صورت نظر آئی۔ ٹونی نے اُسے اپنی جگہ کھڑا کیا اور ہم سستانے کے لیے کیبن کی طرف ہولیے۔ وہاں اُس نے بتایا: "صبح سویرے ایک ملّاح نے اس کی پُشت میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی تو اُس نے اُسے پکڑ کر اچھی طرح خبر لی۔ اب سب لوگ بلا چون وچرا احکام بجا لا رہے ہیں۔"

بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کرکے اچھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ اچانک زوردار دھماکا سُنائی دیا۔ فوراً بعد مختصر وقفوں سے دو تین دھماکے اور ہوئے۔

"خدا کی پناہ!" ٹونی یکدم کھڑا ہوگیا۔ "معلوم ہوتا ہے پانی کی لہریں عرشے کا کمرہ بہا کر لے گئیں۔"

اُس نے آگے بڑھ کر اپنے بستر کے نیچے سے ایک رسّی نکالی۔ اس کا ایک سرا اپنی کمر سے باندھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں دے کر بولا: "پہلے میں باہر جاؤں گا۔ تم سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر رسّی مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد تمہیں اُوپر کھینچ لوں گا۔"

عرشے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ٹونی کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ کمرے کا نام ونشان نہ تھا۔ اگلا مستول ہوا کے دباؤ سے دُہرا ہو چکا تھا۔ ٹونی نے فحش سی گالی دی اور پھر مجھے حکم دیا: "نیچے سے کلہاڑا لے آؤ۔" خیال تھا مستول کاٹنے سے شاید جہاز پر طوفان کا دباؤ گھٹ جائے۔ مَیں نے کلہاڑا لاکر اُسے دے دیا۔ وہ پانی کی لہروں سے زور آزمائی کرتا ہوا آہستہ آہستہ مستول

کی طرف بڑھا۔

عرشے پر کھڑا ہونے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنے کام میں جُتا رہا۔ رسّیاں کاٹنے کے بعد مستول پر ایک دو ضربیں ہی ماری تھیں کہ اچانک دو ملّاح نمودار ہوئے اور چیختے چلّاتے، ہاتھ لہراتے اس کی طرف لپکے۔ غالباً اُسے مستول کاٹنے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لمحے میٹ بھی پہنچ گیا۔ اُس نے پَل بھر میں صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا اور رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس سے اُلجھ پڑے۔ معاً خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک پہاڑ ایسی لہر اُٹھی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سمندر کا سارا پانی دیکھتا چنگھاڑتا جہاز پر اُمڈ آیا ہو۔ مَیں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں اور رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر سیڑھیوں کی اوٹ میں ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا ٹونی مستول کے ساتھ چمٹا کھڑا ہے۔ پانی کی منہ زور لہر میٹ اور ملّاحوں کو اپنے ساتھ بہا کر عرشے کے دوسرے کنارے پر لے گئی ہے اور وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے غوطے کھا رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور لہر عرشے پر چڑھ دوڑی۔ میٹ اور اس کے ساتھی لمحہ بھر کے لیے پانی کی سطح پر اُبھرے اور پھر ہمیشہ کے لیے سمندر کی پہنائیوں میں ڈوب گئے۔

لہروں کا زور ٹوٹا تو ٹونی دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ اچانک مستول چرچرایا اور دھماکے کے ساتھ نیچے آرہا۔ مَیں سمندر کا نظارہ کرنے میں محو تھا۔ اب جو اس طرف رُخ کیا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میرا بُوڑھا محسن وہاں موجود نہ تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ رسّی کو بار بار جھٹکے دیے، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہیں ٹونی بھاری بھرکم مستول کے نیچے دب کر ہلاک نہ ہوگیا ہو۔

عرشے پر لہروں کی یلغار مسلسل جاری تھی۔ سیڑھیوں سے نکل کر اُسے تلاش کرنے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اچانک رسّی کو جھٹکا لگا۔ مَیں فوراً چوکنا ہوگیا اور آہستہ آہستہ رسّی کھینچنے لگا اور پھر دوسرے سرے پر ٹونی نمودار ہوا۔ اسے بےحس وحرکت دیکھ کر گمان گزرا وہ مر چکا ہے، لیکن پھر اس کا سینہ پھولتے اور پچکتے دیکھ کر جان میں جان آئی۔ وہ زندہ، لیکن بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کھینچ کر اُسے کیبن میں پہنچایا اور اس کی کمر سے رسّی کھول کر بستر پر لٹا دیا۔

سر کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ خون صاف کرکے پٹّی باندھی۔ پھر شراب کے چند قطرے منہ میں ٹپکائے۔ چند گھنٹے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں، لیکن ان میں زندگی کی چمک مفقود تھی۔ اس کے حواس ابھی پوری طرح بحال نہ ہونے تھے۔ مَیں نے زبردستی تھوڑی سی شراب اور پلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ وہ بدستور بےحس وحرکت پڑا خالی خالی نظروں سے گرد وپیش کا جائزہ لیتا اور مجھے گھورتا رہا۔

دن ڈھلتا رہا۔ اپنی بےبسی پر بار بار آنکھیں بھر آئیں۔ کئی دن سے ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ میں نہ گئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح باورچی خانے میں پہنچا۔ وہاں ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ برتن ٹوٹے اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ ملّاحوں نے کوئی شے سلامت نہ رہنے دی تھی۔ تلاشِ بسیار کے باوجود کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ اچانک طوفان کے شور اور چنگھاڑ میں پستول چلنے کی آواز سُنائی دی۔ روشندان میں سے جھانک کر دیکھا عرشے پر دس بارہ ملّاح ایک لائف بوٹ پر قبضہ جمانے کے لیے آپس میں نبرد آزما تھے۔ زندگی اور موت کی یہ جنگ ابھی جاری تھی کہ ایک لہر اُٹھی اور ملّاحوں کو کشتی سمیت بہا کر لے گئی۔ ٹھیک اسی لمحے دوسرا مستول دھماکے سے ٹوٹ کر عرشے پر آگرا اور جہاز لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ مجھے زندگی میں اس قسم کے حادثات سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا، لیکن فوراً سمجھ گیا جہاز بھنور میں پھنس گیا ہے۔

کیبن میں پہنچا تو ٹونی اُٹھ کر بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اب وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ مَیں نے مختصر الفاظ میں تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ بھنور میں پھنسنے کی خبر سُن کر وہ بُری طرح چونکا اور آنکھیں مَلتے ہوئے بولا: "ہم طوفان میں گھر گئے ہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے ہمارے سوا جہاز پر اور کوئی شخص موجود نہیں۔"

مَیں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور بولا: "آؤ یہاں سے جلد از جلد نکلنے کی تدبیر کریں۔"

اُسے لڑکھڑاتے دیکھ کر خیال آیا میرا بُوڑھا اور خستہ حال ساتھی کبھی عرشے تک نہ پہنچ سکے گا، لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ بُڑھاپے اور تھکن سے نڈھال جسم میں نجانے کہاں سے اتنی قوّت آگئی تھی کہ وہ نہ صرف خود چل کر انجن رُوم میں پہنچا، بلکہ مجھے بھی سہارا دیے رکھا۔ وہیل تیزی سے گھوم رہا تھا۔ ٹونی نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر پھر فوراً پیچھے ہٹ گیا اور بولا: "دیر ہوگئی۔ اب سو آدمی مل کر بھی اس کو نہیں روک سکتے۔"

جہاز آہستہ آہستہ منجدھار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چکر اتنے پُرزور تھے کہ ہم عملاً عرشے سے چپک کر رہ گئے۔ معاً خوفناک دھماکا ہوا۔ شاید کوئی مستول ٹوٹ کر سمندر میں گر پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے ساتھ ہی ہوا کا دباؤ یک لخت کم ہوگیا اور جہاز جو پہلے لٹو کی طرح تیزی سے گھوم رہا تھا، اب آہستہ آہستہ چکر کھانے لگا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن جہاز بُری طرح لرزا

اور جس طرف ہم موجود تھے، اس پہلو سے ترچھا ہو کر پانی میں ڈوبنے لگا۔ ٹونی چلّایا: "جہاز اُلٹ رہا ہے۔ رسّیاں پکڑ کر مخالف سمت کے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرو، ورنہ بچنے کا کوئی امکان نہ رہے گا۔"

رسّیوں کی مدد سے ہم جلد ہی دوسرے سرے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے تیرنا بالکل نہ آتا تھا، لیکن اس وقت ذہن میں اس کا خیال تک نہ آیا۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ مجھ پر نہیں، کسی اَور شخص پر بیت رہی ہو۔ ٹونی ساتھ نہ ہوتا تو میں کب کا ڈوب جاتا۔ اُس نے مجھے پکڑ لیا اور میرا سر پانی سے باہر نکالے رکھا۔ پھر تیرتے ہوئے ایک مستول کی طرف بڑھا جو خاصے فاصلے پر تھا۔ جلد ہی میری آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھانے لگی اور میں نے نیم غنودگی کے عالم میں جہاز پر آخری نظر ڈالی۔ صرف سینے میں گڑی ہوئی کیل کی نوک پانی سے باہر نظر آ رہی تھی۔ مجھے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہی۔

ہوش آیا تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا میں کہاں ہوں؟ پھر سمندر کے شور اور ہوا کی سائیں سائیں نے تلخ حقیقت کا احساس دلایا اور گزرے ہوئے بھیانک واقعات کی یاد ذہن میں تازہ ہو گئی۔ میں مستول کے ساتھ رسّی سے بندھا ہُوا تھا — کسی قسم کی حرکت ممکن نہ تھی۔ ٹونی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے اُس کا نام لے کر پکارا، لیکن پانی کے شور اور گڑگڑاہٹ میں میری آواز دب کر رہ گئی۔ تنہائی اور اکیلے پن کے زہریلے احساس نے رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑا دی اور میں زور زور سے رونے لگا۔

رونے سے دل کا غبار کسی قدر ڈھل گیا، لیکن اب بھوک اور سردی نے کچوکے لگانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد مینہ برسنے لگا۔ میں نے منہ کھول دیا اور پیاس بجھائی۔ بارش رُکی تو آسمان پر ستارے جھلملانے لگے۔ ہوا کے تھم جانے سے سردی کی شدت کم ہو گئی، لیکن میرا جسم اور دماغ بالکل سُن تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں یُوں محسوس ہوتا جیسے میرا جسم فضاؤں میں پرواز کر رہا ہو اور میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔

تصوّرات کی دنیا سے اُبھرا تو اُجالا پھیل رہا تھا۔ سمندر میں طغیانی کی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ گردن گھمائی تو ٹونی بھی نظر آ گیا۔ وہ مستول کے سرے سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُسے پکار کر اپنی طرف متوجّہ کرنے کی کوشش کی، لیکن بے سُود۔ پھر دل میں خواہش اُبھری کہ کھسک کر اُس کے پاس پہنچنا چاہیے، مگر کیسے؟ سمندر کے پانی سے رسّی کی گرہ پھُول گئی تھی اور اسے کھولنا ممکن نہ تھا۔ اپنے آپ کو زندہ پا کر تھوڑی دیر پہلے جو ناقابلِ بیان مسرّت ہوئی تھی، سب خاک میں مِل گئی۔ سمندر کے غیظ و غضب کے بعد اب ایک نیا پھندا گلے میں پڑ گیا تھا جس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مستول کی سخت لکڑی سے چمٹے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ چھاتی اور پسلیاں دُکھنے لگیں۔ سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی، لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

تاحدِ نظر پانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ دن کا اُجالا پھیلنے کے ساتھ ساتھ افق پر عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کی سُرخ روشنی نمودار ہوئی۔ زندگی میں شفق کا اتنا گہرا رنگ کبھی نہ دیکھا تھا۔ سخت حیرت ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد جب سُورج نکلا، تو اس کا رنگ بھی اسی طرح گہرا سُرخ تھا اور یوں محسوس ہوتا جیسے خون میں نہایا ہوا ہو۔ اچانک ٹونی کی حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز نے چونکا دیا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجّہ پایا، تو ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا: "لڑکے، میرا دماغ تو نہیں چل گیا؟ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، کیا تمہیں بھی نظر آ رہا ہے؟"

"ہاں، بالکل۔ سُورج کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے گویا اس سے خون ٹپک رہا ہو۔"

"کمال ہے!" ٹونی نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ وہ سچ مچ پریشان اور متفکر تھا۔

اس وقت تک سُورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ تمام کائنات اس کی سُرخ روشنی میں ڈوب گئی اور گرمی کی شدّت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ خاصی جدّوجہد کے بعد میں نے رسّی کھول کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا اور کھسک کر ٹونی کے قریب آ گیا۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ جلد ہی گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ ہم بار بار سمندر میں غوطے لگاتے۔ ہماری حالت بھوک اور پیاس سے پہلے ہی ابتر تھی، اس ورزش نے بالکل ادھ مُوا کر ڈالا۔

دوپہر کے وقت پانی میں عجیب الخلقت اور ہولناک جانور تیرتے نظر آئے۔ یہ دیوقامت جانور دس دس بارہ بارہ گز لمبے، بے حد مکروہ اور ڈراؤنے تھے۔ ہم نے خوف سے اپنی ٹانگیں مستول پر رکھ لیں اور بے حس و حرکت بیٹھ گئے۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی تعداد میں حیرت انگیز سرعت سے اضافہ ہو رہا تھا اور ہم دم سادھے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ نجانے رات کے وقت اس ہولناک مقام پر کن کن آفات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

شام کا اندھیرا پھیلا تو عجیب الخلقت جانوروں کے وجود سے رنگ رنگ روشنی خارج ہونے لگی۔ اس میں پُراسرار اور گہرا سُرخ رنگ نمایاں تھا۔ خوف کے مارے زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ ہم دیر تک حیرت کے عالم میں اس عجوبۂ روزگار بحری مخلوق کو دیکھتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی چھانے

لگی۔ اسی عالم میں ٹونی کی آواز میلوں دُور سے آتی سنائی دی: "اُٹھو، لڑکے! دیکھو سُورج پھر نکل آیا ہے... سُرخ سُرخ، خون آلود سُورج۔"

میں نے بمشکل نیند سے بند ہوتی آنکھیں کھولیں۔ مجھے ٹونی کی مداخلت بے حد ناگوار گزری۔ اُس نے مجھے ایسی نیند سے بیدار کر دیا تھا جہاں میں بھوک اور پیاس کے اذیّت ناک کچوکوں سے محفوظ تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھوک اور پیاس کی تلخی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور پچھلے سارے مصائب بھول گئے۔ اس لیے میں نے خون آلود سُورج کے دوبارہ طلوع میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے مسلسل تارے سے ناچتے دکھائی دیتے۔ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے پانی کے نظارے سے پیاس بڑھ گئی اور میرے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ ٹونی میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر بولا: "سنو لڑکے! سمندری پانی سے اپنے ہونٹ تر کر لو۔ پیاس کی شدت کم ہو جائے گی، لیکن خبردار، پانی حلق سے نیچے نہ اترنے پائے۔"

میں نے فوراً اس نصیحت پر عمل کیا، مگر ہونٹ تر کرنے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا اور پانی کا بڑا سا گھونٹ پی لیا۔ مجھے توقع تھی، اب حلق میں شدید جلن ہو گی اور کانٹے سے چبھنے لگیں گے، لیکن ایسا کوئی ردِّعمل ظاہر نہ ہُوا۔ پانی خلافِ توقع نمک سے پاک اور حد درجے میٹھا تھا جیسے کسی صاف شفّاف چشمے سے اُبل رہا ہو۔ میں نے اپنا منہ پانی سے لگایا اور غٹ غٹ پانی پینے لگا۔ کل والی عجیب الخلقت اور ہولناک مخلوق کا کہیں نام و نشاں نہ تھا۔

ٹونی کے چہرے پر رنج اور افسوس کے سائے لہرانے لگے۔ اُس نے سوچا میرا دماغ چل گیا ہے۔ پھر مجھے اوک سے بار بار پانی پیتے دیکھ کر صبر کا دامن چھوٹ گیا اور وہ میری تقلید پر اُتر آیا۔ اُس کی حالت مجھ سے کچھ کم ابتر نہ تھی۔ خوب اچھی طرح پیاس بجھانے کے بعد ہوش و حواس بحال ہوئے تو میں نے پُوچھا: "ایسا معجزہ کس طرح ممکن ہے؟"

اُس نے کندھے اُچکائے۔ "کم از کم اس بات کی توجیہہ ضرور کی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات جب کوئی بڑا دریا سمندر میں گرتا ہے تو اس کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا ہے کہ پانی اپنا راستہ بناتا ہُوا سمندر میں خاصی دُور تک چلا جاتا ہے، لیکن عجیب و غریب سمندری مخلوق اور اس پُراسرار سُرخ رنگ کی توجیہہ کیا ہو گی؟ میری زندگی سمندروں کے سینے پر تیرتے اور سفر کرتے کٹی ہے۔ سچ کہتا ہوں پہلے نہ تو ایسے پُراسرار مناظر دیکھنے کا کبھی اتفاق ہُوا اور نہ کانوں ہی نے ان کے متعلق کوئی بات سُنی۔ قسمت نے ہمیں یقیناً کسی نئی اور محیرالعقول دُنیا میں لا پھینکا ہے۔"

چند گھنٹے بعد ہم نے بمشکل آکٹوپس سے ملتا جُلتا ایک سمندری جانور شکار کیا۔ ٹونی نے چاقو سے اس کے ٹکڑے کیے۔ خلاف توقع بےجان تھا۔ اس کا سیاہی مائل چپچپا گوشت مزے لے لے کر کھا گئے۔ ذرا کراہت محسوس نہ ہوئی۔ آکٹوپس کا گوشت ہماری بھوک کے مقابلے میں ناکافی تھا، لیکن اتنا فائدہ ضرور ہُوا، تیزی سے ختم ہوتی ہوئی جسمانی قوّت قدرے بحال ہو گئی۔

دوپہر کے وقت آفتاب کی زبردست تمازت نے ہمارا بدن جھلس ڈالا اور ہم فریبِ نظر میں مبتلا ہو گئے۔ یکایک دُور خشکی سی نظر آنے لگی۔ پھر ساحل سے بے شمار کشتیاں اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیتیں، لیکن جلد ہی یہ سب مناظر ایک ایک کر کے فضا میں تحلیل ہو جاتے۔

اور پھر سامنے پہاڑ نظر آنے لگے۔ ہمارا خیال تھا دُوسرے مناظر کی طرح یہ بھی فریبِ نظر کا کرشمہ ہیں، تھوڑی دیر بعد فضا میں تحلیل ہو جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ یہ آتش فشاں پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ سُرخ مینار نما چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ پھر بھی ہر آن یہی دھڑکا رہا کہ یہ اب غائب ہوئے کہ تب۔ دن ڈھل گیا اور پہاڑ بدستور نظر آ رہے تھے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ سراب نہیں، حقیقت ہیں۔ اُمید و مسرّت کی لہر دلوں میں دوڑ گئی۔ "زمین..." ہم نے نعرہ لگایا اور ایک دوسرے سے لپٹ کر بچّوں کی طرح رونے لگے۔

پانی کی نرم اور ہلکی رَو ہمیں آہستہ آہستہ پہاڑوں کی طرف دھکیلتی رہی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج گھٹتا رہا۔ قریب پہنچے تو یہ پہاڑ پتھروں کی ایک عظیم دیوار کی مانند دکھائی دیے۔ ایک بار پھر مایوسی نے آ لیا۔ ٹونی بولا: "خدا جانے ان پہاڑوں میں کھانے کو بھی کوئی شے دستیاب ہو گی یا نہیں۔ فضا میں چڑیا تک اُڑتی نظر نہیں آتی۔"

میں فوراً بولا: "چڑیاں نہ سہی مچھلیوں پر گزارہ کر لیں گے۔" میری نظریں زمین پر جمی ہُوئی تھیں جو ہر لحظہ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

اگلے دن ہم ایک کھاڑی میں داخل ہُوئے اور صبح سویرے ریتیلے ساحل پر جا اُترے۔ خشکی پر پہنچنے کا احساس بڑا مسرور کُن اور راحت انگیز تھا۔ اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں خوشی سے دیوانہ وار ناچنے کودنے اور قہقہے لگانے لگا۔ ٹونی خلافِ توقع سنجیدہ تھا۔ اُس کے چہرے پر سوچ اور فکر کی پرچھائیں رقصاں تھیں۔ میں پُوچھے بغیر نہ رہ سکا: "ارے ٹونی! کیا تمہیں زندہ بچ جانے کی خوشی نہیں؟ میرے خیال میں اب ہم بچ بچا کر محفوظ جگہ پہنچ گئے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں لڑکے! میں خوش ہوں۔" اس نے نیم دلی سے جواب دیا۔ وہ مجھ سے اپنے حقیقی احساسات چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تاہم میں نے اصرار نہ کیا۔ میں اُس وقت کسی قیمت پر اپنی خوشی غارت کرنا نہ چاہتا تھا۔

ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تمام چٹانوں کا رنگ گہرا سُرخ تھا۔ ریت بالکل پاؤڈر کی طرح باریک اور نفیس تھی۔ میں نے مُٹھی میں بھر لی۔ پھر مُٹھی کھول کر ٹونی کو دکھانا چاہی، تو وہ ساری کی ساری پھسل کر گر پڑی ——— جو تھوڑی بہت ہتھیلی پر رہ گئی اُسے میں نے پانی میں پھینک دیا۔ جونہی ریت پانی میں گری ایک سُرخ سا دھبّا نمودار ہوگیا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ٹونی بھی یہ منظر دیکھ چکا تھا اور فرطِ حیرت سے گنگ تھا۔ اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات سے میری رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ہم دونوں بُت بنے دیر تک اُس جگہ نظریں جمائے کھڑے رہے جہاں پانی میں سُرخ دھبّا نمودار ہوا تھا اور اب بتدریج معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ٹونی کندھے اُچکاتے ہوئے بولا "بہتر ہوگا ہم رات پڑنے سے پہلے کوئی مناسب ٹھکانہ تلاش کر لیں۔"

میں نے اعتراض کیا "نہیں، پہلے کھانے کا بندوبست ہونا چاہیے۔" اور ہم کھانے کی تلاش میں چٹانوں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ انہیں عبور کرنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ چٹانیں اگرچہ زیادہ اونچی نہ تھیں لیکن بھُربھُری زیادہ تھیں۔ ہمارے قدم دھنس جاتے اور چلنے میں دشواری پیش آتی۔ پھر چاروں طرف پھیلی ہوئی سُرخ روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم پوری طرح آنکھیں بھی نہ کھول سکتے۔

چوٹی پر پہنچے، تو دُور آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ نظر آیا۔ یہ وہی پہاڑ تھے جو ہمیں سمندر میں سفر کرتے وقت نظر آئے تھے۔ قریباً بیس میل کے فاصلے پر ہوں گے۔ اُن کے دامن میں جگہ جگہ سیاہ دھبّے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا یہ ضرور جنگلات ہیں اور ان میں کھانے کی کوئی شے یقیناً دستیاب ہو جائے گی۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک وسیع اور بے آب و گیاہ ریتلا سمندر عبور کرنا تھا۔

بیس میل کا فاصلہ کچھ کم نہ تھا۔ ٹونی بولا "ہمیں اپنے ساتھ پانی ضرور رکھنا چاہیے ورنہ گرمی سے ہلاک ہو جائیں گے۔" سوال پیدا ہُوا کیسے؟ ہمارے پاس ہاتھوں اور پھٹے پُرانے کپڑوں کے سوا کوئی شے ایسی نہ تھی جس میں پانی بھر کر ساتھ لے سکتے۔ ہم نے برتن کی تلاش میں اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارا لیکن ننگی اور بھربھری سُرخ چٹانوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ سبزے کا کہیں نام و نشاں نہ تھا۔ ماحول پر چھائی ہوئی دہشت اور ویرانی آہستہ آہستہ ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اعصاب جواب دے چلے تھے لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری۔ چُپ چاپ آگے بڑھتے رہے۔ ایک تنگ سے مقام پر کھاڑی عبور کی۔

ناکامی اور ماحول کی یکسانیت سے حوصلے ٹوٹنے لگے۔ ٹونی بار بار مُٹھیاں بھینچ کر ہوا میں لہراتا اور غصّے میں بڑبڑاتا۔ قریب تھا ہم تھک ہار کر ریت پر ڈھیر ہو جاتے کہ اچانک سامنے ایک سُرخ چٹان کے دامن میں بڑا سا دھبّا نظر آیا۔ ٹونی ایک لمحے تک بغور دیکھتا رہا پھر بولا "وہاں غار لگتے ہیں۔ آؤ چلیں، شاید کوئی شے ہاتھ لگ جائے۔ میں تو صبح سے اب تک ایک جیسا منظر دیکھ دیکھ کر اُکتا گیا ہوں۔"

غار کا دہانہ حیرت انگیز طور پر چوڑا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر یُوں محسوس ہُوا کوئی اژدھا مُنہ کھولے پڑا ہے اور ہمیں ابھی ہڑپ کر جائے گا۔ محراب نما گنبد کی چوٹی سے آگے سربفلک دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ غار کی گہرائی کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ دہانے سے چند فٹ آگے بے پناہ تاریکی کا تسلط تھا۔ ہم کوشش کے باوجود اندر دیکھنے میں ناکام رہے۔

جب ہم نے غار میں قدم رکھا تو میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ٹونی میرے ساتھ تھا۔ اس کے باوجود اندر جانے سے دہشت ہو رہی تھی۔ بعید نہ تھا میں ڈر کر واپس بھاگ جاتا، لیکن ٹونی نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اُسے شاید میرے دِلی خوف کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے تسلی دیتے ہُوئے بولا "چلو... چلو... ہمت نہ ہارو۔"

اُس کی آواز تاریک گپھا میں دُور تک گونجتی چلی گئی اور ہمیں دیر تک اس کی بازگشت سُنائی دیتی رہی۔

کھُلی فضا کی تیز سُرخ روشنی نے ہماری آنکھیں چُندھیا دی تھیں۔ اب روشنی سے اچانک غار کی تاریکی میں داخل ہوئے، تو نظروں کے سامنے مکمل تاریکی کا پردہ تن گیا اور ہم اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر قدم بقدم آگے بڑھنے لگے۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا ہم ریت کے بجائے سخت اور ٹھوس زمین پر چل رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں فرش کی ٹھنڈک اور نمی کا احساس بھی ہوا۔

قدموں کی چاپ اور سانس لینے کی آواز، صدائے بازگشت اور اندھیرے غار کے ناچتے لہراتے سایوں کے ساتھ مل کر عجیب دہشت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ ٹونی پر جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی۔ وہ زور زور سے چلانے اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ دوسری طرف سے اس کی بازگشت سنائی دیتی، تو معلوم ہوتا غار میں کوئی بھوت نہاں آ گیا ہے۔ پھر اچانک ہی تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی۔ پھر دُور کہیں

فاصلے پر پتھروں کے گرنے کا خوفناک دھماکا سنائی دیا۔ چند لمحے بعد ایک دھماکا اور ہوا اور پھر یک لخت خاموشی چھا گئی۔ اس کے باوجود تھوڑی دیر تک پُراسرار سیٹیوں کی سی تیز آواز سنائی دیتی رہی اور ہلکی ہلکی گونجتی رہی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی تکلیف سے گہرے سانس لے رہا ہو۔

فرطِ خوف سے ہمارے پاؤں جیسے زمین سے چپک کر رہ گئے۔ آخر خدا خدا کر کے شور تھما اور ہماری جان میں جان آئی۔ پھر دُھند چھٹنے لگی اور ہماری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ کاش! ایسا نہ ہوتا۔ ہم نے زمین دوز راہداری میں جو ہولناک منظر دیکھا، اس نے ہمارے رہے سہے ہوش بھی گم کر دیے۔ آج بھی اس کی یاد کسی دہشت ناک خواب کی طرح لرزہ خیز ہے۔

تاریکی کے بطن سے اَن گنت مجسّمے نمودار ہونے لگے۔ ہر ایک کا پوز اور انداز دوسرے سے مختلف تھا، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی اور وہ تھا خوف اور کرب۔ ہر مجسّمہ خوف اور کرب کی ایک نئی صورت کا مظہر تھا۔ مجسّمہ ساز کے ہُنرمند ہاتھوں نے اذیت اور کرب کی ایک غیر محسوس کیفیت کو ان بے جان پتھروں میں سمو کر جو نقش اُبھارے تھے، اُن پر حقیقت کا گمان ہوتا۔ مجسّموں کی رنگت میں کوئی فرق نہ تھا، گویا کسی ایک ہی پتھر سے تراشے گئے تھے۔ مرد، عورت سب صاف پہچانے جاتے تھے۔ ماؤں نے گود میں بچے اُٹھا رکھے تھے۔ ان کے چہروں پر ممتا کی شفقت بھری مسکراہٹ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ گردنیں نیچے کی طرف خم کھائے ہوئے تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے جگر گوشوں کو چومتے چومتے ٹھٹھک کر رہ گئی ہوں۔

انسانوں کے علاوہ غار میں پرندوں اور جانوروں کے مجسّمے بھی تھے۔ ان میں زیادہ تعداد دیوقامت پرندے "سیمرغ" کے مجسّموں کی تھی۔ اُس کے بڑے بڑے بازو پھیلے دیکھ کر محسوس ہوتا ابھی اُڑ کر فضا میں بلند ہو جائے گا۔ ایک طرف قدیم طرز کے گھریلو برتن بکھرے پڑے تھے۔ یہ مٹّی میں اچھی طرح پکائی ہوئی سُرخ مٹی سے تیار کیے گئے تھے۔ ہم نے جلدی سے دو مٹکے اُٹھائے اور اس عجیب و غریب انسانی عجائب گھر پر الوداعی نظر ڈالے بغیر تقریباً دوڑتے ہوئے باہر آ گئے۔

سرد اور بے جان مجسّموں کی آنکھوں سے ٹپکتا ہوا خوف اور چہرے پر بری کرب و اذیت کا نظارہ بڑا ہولناک تھا۔ باہر پہنچ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور دیر تک خاموش رہے۔ آخر ٹونی نے سرد آہ بھرتے ہوئے یہ خاموشی توڑی اور بولا "اُف! کتنی پُراسرار اور دہشت ناک جگہ تھی۔" بغل میں دبائے ہوئے مٹکے کی طرف اشارہ کیا "لڑکے! دیکھا یہ لوگ کس قدر مکمل اور عمدہ مجسّمے بنانے پر قادر تھے۔ مٹی کے اس برتن کو ٹھیک طرح سے ختم بھی نہ دے سکے کتنی عجیب بات ہے! خیر چھوڑو، ہمیں پانی ذخیرہ کرنے کے لیے برتن مل گئے۔ یہی غنیمت ہے۔ اب پیاس کی اذیت برداشت نہ کرنا پڑے گی۔ زرخیز علاقے میں پہنچنے کے بعد کھانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ڈھونڈ لیں گے۔" ٹونی خوش اُمیدی کا شکار تھا اور میں سوچ رہا تھا غذا کے بغیر اتنے عرصے تک کیونکر صبر ہوگا۔

ہم واپس ساحل پر آئے۔ وہاں مٹکوں میں پانی بھرا اور دوبارہ ایک پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا جو پہلی پہاڑیوں کی نسبت زیادہ عمودی تھی۔ چوٹی تک پہنچتے پہنچتے بُری طرح ہانپنے لگے، چنانچہ سستانے بیٹھ گئے۔ اچانک وہی پُراسرار اور سیٹیوں کی سی آواز سُنائی دی جو ہم نے تاریک غار میں سُنی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی یہ آواز بہت دُور سے آ رہی تھی۔

پہاڑی سے اُتر کر ہم ریت کے سمندر میں داخل ہوئے۔ جسمانی کمزوری اور نقاہت کے مارے قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ جلد ہی چکر آنے لگے۔ ٹونی نے میرا بازو تھام لیا اور میں اس کے سہارے تقریباً گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اُس کا اپنا حال بھی غیر تھا؛ تاہم ابھی اُس کے حواس قائم تھے۔ شام کا دُھندلکا پھیلنے تک ہم اسی طرح قدم بقدم بڑھتے رہے۔ سُرخ پہاڑ اور ان کے دامن میں نظر آنے والے سیاہ دھبّے آخر رات کی تاریکی میں رُوپوش ہو گئے۔ ہم نے ایک ریتلا ٹیلا منتخب کیا اور رات بسر کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

جلد ہی گہری نیند نے آ لیا۔ رات کے پچھلے پہر ٹونی نے جھنجھوڑا۔ "لڑکے، سیٹیوں کی تیز اور پُراسرار آواز پھر سنائی دے رہی ہے۔ یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمین کے سینے سے اُٹھ رہی ہو۔ ذرا کان لگا کر سنو۔" مجھ پر نیند کا غلبہ تھا، بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدلی اور ایک مرتبہ پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر سو گیا۔

صبح سویرے اچانک آنکھ کھل گئی۔ پیٹ میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی۔ سُورج ابھی سُرخ اور پُراسرار پہاڑوں کی اوٹ سے نمودار نہ ہوا تھا۔ ٹونی بھی اُٹھ بیٹھا۔ میں نے بھوک کی شکایت کی اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا لیا۔ ٹونی بے چارہ کرتا؟ بے بسی سے ہاتھ مَل کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ناصحانہ انداز میں بولا "تم اس کا خیال ہی نہ کرو۔ بھوک کا احساس خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چند گھونٹ پانی پی کر دیکھو، شاید کچھ سہارا ہو جائے۔"

میں نے مٹکا اُٹھا کر منہ سے لگا لیا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ پانی پیٹ میں پہنچتے ہی حیرت انگیز تبدیلی رُونما ہوئی۔ معدے کی اینٹھن یکدم ختم ہو گئی اور بھوک کا احساس کم ہو گیا۔ ٹونی دُور پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "لڑکے، میں ساری رات غور کرتا رہا۔ یہ زمین، سورج، ستارے اور سُرخ روشنی سب اجنبی لگتے ہیں۔ ان کا ہمارے کرۂ ارض

سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ میں نے زندگی میں اس طرح کی چیزوں کے بارے میں کبھی نہیں سُنا۔ ہم یقیناً کسی اور نامعلوم سیّارے میں پہنچ گئے ہیں۔ بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے۔"

اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ چمکدار آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے کندھے سکیڑتے ہوئے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔ فوراً بولا: "ہاں دُنیا کے بارے میں تم کیا جانو۔ پہلی مرتبہ گھر سے نکلے ہو۔ چلو اُٹھو، اپنا سفر شروع کریں۔"

ہم جُوں جُوں بڑھتے گئے، پہاڑوں کے دامن میں واقع سیاہ دھبّا بتدریج صاف دکھائی دینے لگا۔ ہمارا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ جنگل ہی تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ گرمی سے بُرا حال ہو گیا۔ اس کے باوجود گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح برابر بڑھتے رہے۔ پیاس ناقابلِ برداشت ہو گئی تو ایک جگہ رُک کر پانی پینا چاہا۔ مشکیزے سے منہ لگایا تو ناگوار حیرت نے آ لیا۔ زندگی بخش سیال پہلے کی طرح شفاف اور بے رنگ نہ رہا تھا۔ اس کی رنگت گہری سُرخ ہو چکی تھی۔ دل تو نہ چاہتا تھا، لیکن پیاس بجھانے کے لیے مجبوراً پینا پڑا۔ یہ نیم گرم تھا؛ چنانچہ اس تلخ احساس میں اور بھی شدّت پیدا ہو گئی کہ ہم پانی نہیں، گرم گرم خون پی رہے ہیں۔

شام کے قریب نباتاتی زندگی کے آثار پہلی مرتبہ نظر آئے۔ ریت کی جگہ سخت زمین نے لے لی تھی اور اس میں کہیں کہیں چھدری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی بھوک پر قابو پائے ہوئے تھے۔ ہری گھاس دیکھ کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فوراً جانوروں کی طرح اس پر منہ مارنے لگے اور پل بھر میں صفایا کر ڈالا۔ معلوم نہیں یہ ہمارا وہم تھا یا سچ، گھاس ہی میں غذائیت تھی کہ ہمارا پیٹ بھر گیا اور مضمحل قوٰی میں جان سی آ گئی۔ اس رات ہم خوب گہری نیند سوئے۔

اگلے دن چند گھنٹوں میں جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ بلند و بالا درخت سَر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے بے حد موٹے تھے جن کے گرد عجیب و غریب شکل کی گول بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ کم از کم انسانی بازو کے برابر موٹی ضرور ہوں گی۔ ٹونی نے ایک بیل نوچ کر الگ کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر زور لگایا اور بیل کی باریک سی چھال اُتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ اندر سے گاڑھی سُرخ رطوبت بہہ نکلی اور چھال کا ٹکڑا پھسل کر ہمارے ہاتھ سے گر پڑا۔

ٹونی نے ہار نہ مانی۔ ایک تیز اور نکیلا پتھر ڈھونڈ کر لے آیا اور موٹی سی بیل کاٹنے لگا۔ پتھر کی دو تین بھرپور ضربیں لگائی تھیں کہ اچانک اس کے منہ سے حیرت اور خوف میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی اور پتھر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا: "خدا کی پناہ! اس میں جان ہے۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

لمحے بھر کے لیے یوں محسوس ہوا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھیں مَل کر غور سے دیکھا تو بیل کے چھوٹے چھوٹے مساموں میں سے گاڑھا سُرخ لیسدار مادّہ خارج ہو رہا تھا۔ زخمی بیل نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ پہلے وہ کسی کنڈلی مارے ہوئے سانپ کے مشابہ تھی۔ اب کوبرا سانپ کی طرح آہستہ آہستہ بَل کھانے لگی۔ اس کی حرکات بالکل جانداروں ایسی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے اندر سے ایک عجیب و غریب شور سا اٹھا جیسے کوئی دم توڑتے ہوئے ہچکیاں لے رہا ہو۔ ٹونی نے بدحواس ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا: "یہ کیا طلسم ہے! میں پاگل تو نہیں ہو رہا؟"

میں خود حیرت سے دوچار تھا، کیا جواب دیتا۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس نے چُپ سادھ لی اور کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میرا بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا: "آؤ لڑکے، اس جنگل سے دُور چل جائیں۔ یہ جگہ منحوس ہے۔ پہاڑ کے دوسری طرف شاید حالات بہتر ہوں۔ لیکن پہلے ہمیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور تلاش کرنا چاہیے۔"

گھنٹوں چلنے کے بعد ہم جنگل کے دوسرے کنارے پہنچے۔ آگے ایک وسیع میدان تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے ہم ان کے قریب پہنچ گئے۔ چاروں طرف گہرا سکوت تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ یہاں کی فضاؤں میں کبھی انسان سانس لیتے ہوں گے۔

ہم پہلی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ اندر اسی قسم کے چند عجیب اور ڈراؤنے مجسّمے موجود تھے جن کا نظارہ ہم نے غار میں کیا تھا۔ زمین پر کسی ناقابلِ شناخت دھات کا بڑا سا نیم شکستہ برتن پڑا تھا اور اس کے اندر سے سبز کونپلیں جھانک رہی تھیں۔ ٹونی کی نظر پڑی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور چلّایا: "ٹماٹر...." اس کی بات ٹھیک تھی۔ ننھے مُنّے ٹماٹر ابھی کچے تھے۔

ہم نے سب توڑ کر کھا لیے۔ پیٹ پھر بھی نہ بھرا اور مزید کھانے کی تلاش میں ایک جھونپڑی سے دُوسری جھونپڑی میں بھٹکتے رہے۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جھونپڑیوں میں بے جان سنگی مجسّموں کے سوا کوئی شے موجود نہ تھی۔ انسانوں اور جانوروں کے مجسّمے جن کے چہروں کے نقوش کسی اندرونی صدمے اور کرب کی وجہ سے بگڑ کر بے حد ڈراؤنے اور بھیانک ہو گئے تھے۔ چھوٹے بچّوں کے چہروں سے البتّہ بدستور فطری معصومیت اور بھولپن ٹپک رہا تھا۔

جھونپڑیوں میں چاروں طرف مٹی، پتھر، لکڑی اور ہڈیوں کے بنے

ہوئے ہتھیار اور برتن بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ کئی چیزیں تو ہمارے لیے بالکل اجنبی اور نئی تھیں۔ نجانے بستی کے مکینوں پر کیا افتاد پڑی تھی کہ وہ جہاں اور جس حال میں بیٹھے تھے، منجمد ہو کر رہ گئے۔ کہیں جدوجہد یا مزاحمت کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

ٹونی بار بار بڑبڑاتا: "ناممکن... حیرت انگیز! ناممکن..." میرے دریافت کرنے پر بولا: "میں نے جس پتھر سے بیل کاٹنے کی کوشش کی تھی وہ کسی آتش فشانی لاوے کا ٹکڑا تھا، لیکن یہاں اس کا وجود حیرت انگیز ہے۔ آتشیں لاوا جس زمین پر ایک مرتبہ گر جائے، وہاں ہمیشہ کے لیے نباتات اور سبزے کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ سوچتا ہوں، اگر یہ پتھر واقعی آتش فشانی لاوے کا حصّہ تھا اور اس بستی پر آتش فشاں ہی نے تباہیاں ڈھائی ہیں تو گھنا جنگل اس کا نشانہ بننے سے کیونکر محفوظ رہا؟ ممکن ہے، جو اپنے ساتھ نباتاتی زہر لانے آیا کہ آتش فشانی لاوے سے ڈر لے آئی ہو اور اس جگہ جنگل پیدا ہو گیا ہو۔"

ٹونی دیر تک اسی طرح کے مختلف مفروضے پیش کرتا اور پھر انہیں رد کرتا رہا۔ میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ آخر وہ خاموش ہو گیا اور عجیب و غریب شکل کے دو پتھر اُٹھا کر انہیں زور زور سے رگڑنے لگا۔ ان سے چنگاریاں سی جھڑنے لگیں۔ پھر اُس نے ایک جھونپڑی سے کچھ بوسیدہ چیتھڑے اکٹھے کیے اور پتھر رگڑ رگڑ کر انہیں آگ دکھا دی۔ ہم نے جلدی جلدی دُوسری جھونپڑیوں سے مختلف چیزیں جمع کیں اور انہیں آگ میں جھونک دیا۔ الاؤ رات بھر روشن رہا اور ہم اس کے قریب پاؤں پسار کر سوتے رہے۔

صبح دن چڑھے آنکھ کھلی۔ ٹونی کہیں نظر نہ آیا۔ میں جھونپڑی سے نکل کر جنگل کی طرف ہو لیا کہ شاید وہیں چلا گیا ہو۔ پھر بھوک بھی ستا رہی تھی اور مجھے توی اُمید تھی کھانے کے لیے بھی وہاں سے ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ کئی درختوں کی چوٹیوں پر پھلوں کے گچھے لٹکتے نظر آئے لیکن افسوس! وہ بہت بلندی پر تھے اور وہاں میرا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر نرم و نازک کونپلوں کا انتخاب کیا جو بڑی جسامت کی بیلوں سے پھوٹ رہی تھیں۔

میں نے زمین پر گری ہوئی ایک کونپل اُٹھائی۔ ابھی اسے چبانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس نے سانپ کی طرح اپنے مرکز ...... میں حیرت زدہ کھڑا دیکھتا رہا۔ جب اس نے میری کلائی کے گرد حلقہ کس لیا اور مجھے چبھن محسوس ہوئی تب ہوش آیا اور ہاتھ جھٹک کر اسے پھینکنے کی کوشش کی، لیکن وہ تو جیسے میری کھال میں پیوست ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے پوری طاقت صرف کر کے اسے نوچ پھینکنے میں کامیاب ہوا۔ ذرا تصوّر کیجیے کلائی کے گرد خون کی ننھی ننھی سُرخ بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ غور سے دیکھا تو باریک سے سوراخ بھی نظر آ گئے۔ میری حالت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جنگل کی ہر شے آدم خور تھی۔ اس انکشاف نے حواس باختہ کر دیا اور میں سرپٹ بھاگتا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ آخر ایک دریا کے کنارے جا کر دم لیا۔ اس کا پانی صاف شفاف اور میٹھا تھا۔ خوب سیر ہو کر پیا۔

دوبارہ اُٹھ کر کھڑا ہوا تو سمت کا کچھ اندازہ نہ رہا کہ میں کس طرف سے آیا تھا اور کس طرف جانا ہے۔ سوچ میں پڑ گیا کیا کروں؟ آخر دریا کے کنارے کنارے ہو لیا۔ جلد ہی کسی آبشار کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس بھیانک سنّاٹے میں آبشار کی آواز کسی ساز سے کم نہ تھی۔ میں نے تہیّہ کر لیا اس تک پہنچ کر دم لوں گا۔

آبشار صدف توقع بہت دُور نکلی، لیکن بڑی حسین اور پُرفضا جگہ پر تھی۔ ارد گرد کا منظر دیکھ کر ساری تھکن اور جھنجھلاہٹ جاتی رہی اور میں اس کی خوبصورتی میں ڈوب گیا۔ چاروں طرف رنگ برنگے خوشنما پھول کھلے تھے۔ ان کے پودے غیر معمولی طور پر موٹے اور قد آور تھے۔ سب سے چھوٹے پودے کی اونچائی میرے قد سے کم از کم دُگنی ہو گی۔ گھاس بھی بکثرت تھی۔

آہستہ آہستہ چل کر ایک پودے کے قریب پہنچا۔ اس کا پھول سفید رنگ کا تھا لیکن کنارے کسی قدر خمیدہ اور سنہری تھے۔ اتنا خوبصورت اور پیارا پھول میں نے پہلے کہیں نہ دیکھا تھا۔ ذرا اور آگے بڑھا تو پھول نے اپنی پنکھڑیاں سمیٹ لیں اور پھر یُوں محسوس ہوا وہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو سوچا یہ میرے وہم کا کرشمہ ہے لیکن اندر ہی اندر کوئی غیبی قوّت پُکار رہی تھی۔ خطرہ ہے... خطرہ! میں بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھیک اسی لمحے کاسۂ گل کا منہ دوبارہ تیزی سے کھلا۔ پودا لہرایا اور ٹھیک اس مقام پر جھپٹا جہاں ایک سیکنڈ پہلے میں کھڑا تھا۔ فضا میں پٹاخے کی سی آواز گونجی۔ کاسۂ گل کا منہ بند ہو گیا۔ پودا آہستہ آہستہ سیدھا ہوا اور اپنی اصل حالت پر واپس آ گیا۔ زمین پر جس جگہ اس کی پنکھڑیاں ٹکرائی تھیں وہاں اب گھاس پھوس کے بجائے مٹی نظر آ رہی تھی۔ خدا کی پناہ! کاسۂ گل نے سب کچھ سمیٹ لیا تھا۔ میں اگر وہیں کھڑا رہتا تو... اپنے انجام کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ میں سحر زدہ کھڑا آدم خور پودے کو دیکھتا رہا اور پھر بھاگ نکلا۔

مجھے کچھ خبر نہیں، میں پتھریلے مجسّموں کی بستی میں کیونکر واپس پہنچا۔ صرف اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ بستی کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے سُنا کوئی مجھے میرے نام سے پکار رہا ہے۔ حواس منتشر تھے اس لیے جواب نہ دے سکا۔ پھر کسی نے پُشت پر ایک زوردار دھول جمائی اور مجھے ہوش آ گیا۔ وہ ٹونی تھا۔ اس کی جھولی عجیب قسم کے پھلوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں تو ان پر گویا ٹوٹ ہی پڑا۔ بھوک اتنی

شاید تھی کہ پھلوں کی بدمزگی اور کسیلے پن کا احساس تک نہ ہوا۔

پیٹ بھر چکا تو میں نے ٹونی کو اپنی مہم کا حال سنایا۔ وہ بیٹھا خاموشی سے سنتا اور سر ہلاتا رہا۔ آخر میں بولا، "کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا قصہ ہے؟ صبح سویرے میں خود ایک عجیب و غریب واقعے سے دوچار ہو چکا ہوں۔ جانتے ہو میں نے درختوں کی چوٹیوں پر سے یہ پھل کیسے اتارے؟" اس نے پوچھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگا:

"صبح کاذب کے وقت اچانک آنکھ کھل گئی۔ تم گہری نیند سو رہے تھے۔ جگانا مناسب نہ سمجھا۔ بھوک سے برا حال تھا؛ چنانچہ اکیلا جنگل کی طرف چل کھڑا ہوا۔ وہاں ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ سارے دیو قامت درخت زمین پر گرے پڑے تھے۔ گویا راتوں رات کسی کلہاڑے نے کاٹ کر پھینک دیے ہیں۔ سب سے پہلے ان پھلوں پر نظر پڑی جو میری دسترس میں تھے۔ کسی قسم کا خوف محسوس کیے بغیر میں نے ان سے پہلے اپنا پیٹ بھرا، پھر جھولی بھری اور واپس ہو لیا۔ جنگل کے آخری سرے پر پہنچا تھا کہ خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ پلٹ کر دیکھا۔ اُف میرے خدا! سب درخت اکڑ کر سیدھے ہوتے اور آسمان کی طرف اُٹھتے نظر آئے۔ میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے جھونپڑی میں پہنچ گئے۔ ٹونی نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ بڑے گمبھیر لہجے میں بولا، "تم سوچتے ہوگے، بڈھے کا دماغ چل گیا ہے جو اس طرح کی ناقابل یقین باتیں کر رہا ہے۔ یقین جانو میرا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے خوابیدہ جنگل کو انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتے دیکھا ہے۔ یہ جادو نگری نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم یہاں کب تک اس طرح زندہ رہ سکیں گے؟"

پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ایک جھونپڑی سے مٹی کی بڑی بوتل مل گئی تھی۔ اس میں مٹکے کی نسبت زیادہ پانی سما سکتا تھا۔ ٹونی بوتل اٹھا کر دریا کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ایک جگہ وہ اچانک رکا، بوتل زمین پر رکھی اور کسی چیز کو دیکھتے ہوئے چلایا: "لڑکے جلدی آؤ..... یہ کونپل دیکھو۔ اس کا ناشتہ یقیناً لذیذ ہوگا۔"

میں چار پانچ فٹ پیچھے تھا۔ مجھے چند گھنٹے پہلے والی کونپل یاد آ گئی اور میں چیختے ہوئے اس کی طرف لپکا، "خبردار ٹونی! اسے ہاتھ نہ لگانا!" لیکن افسوس! وہ میرے انتباہ سے پہلے ہی کونپل میں الجھ چکا تھا۔ میری تو صرف کلائی پھنسی تھی ٹونی کا گلا اور کلائی دونوں خون چوسنے والی کونپل کی گرفت میں آ گئے۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا، زبان باہر نکل آئی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ میں بے بسی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اور تو کچھ نہ سوجھا اپنے دانت اس نباتاتی عفریت کے جسم میں گاڑ دیے۔ خلاف توقع نتیجہ حوصلہ افزا نکلا۔ نباتاتی عفریت کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی اور وہ نیم جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔

دہشت زدہ ٹونی کے حواس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بحال ہوئے۔ کلائی اور گردن پر گہرے نیلگوں نشان ابھر آئے تھے۔ ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا: "لڑکے! تم نے ایک مرتبہ پھر مجھے زندگی بخشی ہے۔ میں احسان مند ہوں، لیکن غلطی ٹونی کی نہیں میری تھی۔ آدم خور پھول کا تذکرہ تو میں نے اس سے کیا تھا، مگر کونپل کا واقعہ سنانا یاد نہ رہا۔

ٹونی نے اب تک بڑے حوصلے اور پامردی سے ناموافق حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کی زبان سے کبھی مایوسی کا لفظ نہ نکلا، لیکن اس حادثے کے بعد اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کر دینے کی تلقین شروع کر دی کہ آخر وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہے۔

ایک دن بوتل میں تازہ پانی لانے کے لیے دریا پر پہنچے تو ٹونی بولا، "لڑکے! آج ذرا غسل کر لیں، تازہ دم ہو جائیں گے۔" اس نے کپڑے اتارے اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ایک غوطہ لگانے کے بعد پانی کی سطح پر ابھرا اور پکارا، "تم بھی آ جاؤ۔ یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں، میرے پاؤں تہہ کو چھو رہے ہیں۔" اس نے پھر ڈبکی لگائی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا، لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سر پانی سے باہر نکالا اور کنارے کی طرف تیرنے لگا۔

کنارے پر پہنچتے ہی وہ چپ چاپ گھاس پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے بے حد تشویش ہوئی، دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کا بوڑھا لیکن مضبوط اور کسرتی جسم نیلا پڑ چکا تھا اور دانت بج رہے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا،

"ارے تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

کئی منٹ تک وہ حیرت اور خوف بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر دھیمی آواز میں بولا، "لڑکے! میں نے ابھی جو کچھ دیکھا ہے مجھے خود اس کا یقین نہیں، کیا بتاؤں؟ جب تمہیں پانی میں کودنے کے لیے آواز دے رہا تھا، میرے پاؤں کے نیچے سے اچانک ریت کھسک گئی۔ ساتھ ہی محسوس ہوا جیسے کوئی شے تہہ کی طرف کھینچ رہی ہے۔ حقیقت حال جاننے کے لیے غوطہ لگایا تو ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ میرا پاؤں ایک سوراخ میں دھنس گیا تھا جس کی شکل منہ جیسی تھی۔ بخدا لڑکے! دل دہل گیا۔ وہ منہ حرکت کر رہا تھا۔ میں نے سچ مچ کے دو جیتے جاگتے ریتیلے ہونٹوں کو بزور الگ کر کے اپنا پاؤں چھڑایا اور وہاں سے نکل بھاگا۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ اداسی سے مسکرایا، "تم یقیناً مجھے پاگل سمجھتے ہوگے۔"

"نہیں۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "طلسم و اسرار کی اس سرزمین میں ہر بات ممکن ہے، پھر شک کیسا؟"

پانی بھر کر ہم چل کھڑے ہوئے۔ ابتدا میں جنگل زیادہ گھنا نہ تھا، ہم بہ سرعت آگے بڑھتے رہے۔ پھر جلد ہی گھنے درخت اور جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ ہماری رفتار سست پڑ گئی۔ خاردار جھاڑیوں اور آدم خور بیلوں اور کونپلوں کا خوف کھائے جاتا تھا۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے۔

شام کے سائے پھیل گئے، مگر خوفناک جنگل سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔ ہمارے سر پر دیو قامت درختوں نے پتوں کی سبز چھتری تان رکھی تھی۔ ہماری کوشش تھی اندھیرا ہونے سے پہلے اس ہرے شامیانے کے نیچے سے نکل کر کھلی فضا میں پہنچ جائیں لیکن ناکام رہے۔ پھر اندھیرے میں سفر جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ یہ اندازہ بھی مشکل ہو گیا کہ ہم صحیح سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں یا ایک گول دائرے میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ ایک جگہ نسبتاً صاف مقام دیکھ کر وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بھائیں بھائیں کرتے جنگل میں نیند کسے آتی! ہمیں ایک دوسرے کے احساسات اور خیالات کا بخوبی اندازہ تھا۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے لیکن خوف کو زبان عطا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ خاموش لیٹے ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ معاً درختوں کے چرچرانے کی خوفناک آواز آئی۔ ہمارے دل دہل گئے۔ سارے جنگل پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے درخت نیچے کی طرف جھکنے لگے جیسے سجدہ کر رہے ہوں۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ ہم جنگل کے وسط میں تھے۔ کہیں نکل بھاگنے کا راستہ نہ تھا۔ دیو قامت درختوں کے بوجھ تلے دب کر یقیناً ہلاک ہو جاتے۔ خوف سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ پھر ٹونی کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ میرا بازو جھنجھوڑتے ہوئے چیخا "کسی درخت کے تنے کی پناہ لو، اس طرح وزنی درختوں تلے دب کر ہلاک ہونے سے محفوظ رہیں گے۔"

میں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا لیکن زندہ بچ جانے کی امید نہ تھی۔ سوچا موت کو سامنے پا کر ٹونی موہوم امیدوں کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کھسکتا ہوا ایک تنے تک پہنچ گیا لیکن ٹونی میرے ساتھ نہ تھا۔ اندھیرے اور بدحواسی میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ میں نے اسے آوازیں دیں لیکن درختوں کے شور میں دب کر رہ گئیں۔ آخر اس خیال ذہن سے جھٹکا اور درخت کے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کے خشک اور چوبی وجود میں زندگی کروٹیں لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس کا رس میرے چہرے اور جسم پر ٹپکنے لگا۔ "خون کے آنسو..." میں نے خوف کے عالم میں سوچا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ درخت سرنگوں ہو گئے۔ پتوں اور شاخوں کا شور ختم ہو گیا، مگر پھر زمین کے اندر سے ہیبت ناک آوازوں کا طوفان ابل پڑا۔ سینکڑوں ہتھوڑے زور زور سے پیٹے جا رہے تھے۔ آوازیں دم بدم بڑھتی گئیں اور کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ پھر یک لخت خاموشی چھا گئی۔ میری آنکھیں بدستور بند تھیں اور میں اپنی موت کا منتظر تھا۔ دل ہی دل میں سوچا، آج کوئی معجزہ ہی موت کے منہ سے بچا سکتا ہے۔ اسی عالم میں ٹونی کی آواز آئی۔ وہ مسلسل پکارتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

تمام جنگل روشنی میں نہا رہا تھا۔ میں نے اس روشنی میں درختوں کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ ٹونی بھی چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے جسم سے بھی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولا: "لڑکے! تمہیں علم ہے، تمہارا جسم چمک رہا ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے منہ سے اپنی کیفیت جان کر اس کا چہرہ لٹک گیا۔ اداس لہجے میں بولا، "گویا جنگل کی نحوست نے ہمیں بھی آ لیا۔"

میں زندہ بچ جانے کی خوشی میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ٹونی کی بات سن کر میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ میری اس حرکت سے وہ مشتعل ہو گیا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا: "لڑکے! معاف کرنا، ان عجیب و غریب واقعات نے میرا دماغ الٹ دیا ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

صبح سویرے اٹھ کر دوبارہ روانہ ہوئے۔ چند گھنٹے بعد جنگل سے نکل کر ایک میدان میں پہنچے جہاں رنگ برنگ پھول کھلے تھے اور سبز گھاس کی بہتات تھی۔ راستہ پھولوں کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ ان کی شکل، جسامت اور رنگ اگرچہ آبشار کے قریب پائے جانے والے آدم خور پھولوں سے مختلف تھا، لیکن کون کہہ سکتا تھا یہ آدم خور نہ ہوں گے۔ اندازہ غلط ہونے کی صورت میں موت یقینی تھی، مگر اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ آخر ٹونی مضبوط لہجے میں بولا: "سنو لڑکے! فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں ان پھولوں کے درمیان ہی سے گزرنا ہوگا۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پھولوں کے پہلے قطعے کے قریب پہنچ گیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ چند فٹ پیچھے کھڑا رہا۔ پھر ایک حیرت ناک منظر دیکھنے میں آیا۔ جوں جوں ٹونی آگے بڑھتا، پھول دائیں بائیں پیچھے ہٹتے جاتے۔ میری طرح ٹونی بھی ششدر تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم رک گئے۔ اس کے رکتے ہی پھول بھی بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ پہلے تو خواب کا گمان ہوا لیکن ٹونی کی آواز حقیقت کا احساس دلا رہی تھی۔

پھُول سچ مچ ہم سے ڈر کر پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ہم پھُولوں کے درمیان سے گزر کر دُوسری طرف پہنچے اور کھُلے آسمان کے نیچے ایک چٹان کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ جلد ہی نیند نے آلیا۔ نیند کیا تھی، غشی سی طاری ہو گئی۔ آنکھ اُس وقت کھُلی جب ٹونی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ جنگل کے آرام کا وقت آپہنچا تھا۔ دُور فاسفورس کی روشنی میں دیوقامت درخت زمین بوس ہوتے نظر آئے۔ اس سے بھی عجیب اور دلکش منظر اور تھا۔ پھُول والہانہ رقص کر رہے تھے۔ یُوں محسوس ہوتا سفید پوشاک میں ملبوس سینکڑوں اپسرائیں کسی غیر مرئی ساز کے زیر و بم پر عالمِ بے خودی میں ناچ رہی ہیں۔ ہماری نگاہیں اس منظر پر جم کر رہ گئیں لیکن جلد ہی روشنی مدھم پڑنے لگی اور پُراسرار رقاص تاریکی میں تحلیل ہو گئے۔

باقی رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح میدان پر نظر ڈالی تو وہ بالکل ویران اور اُجڑا ہوا تھا۔ بس کہیں کہیں اکا دکا مُرجھائے ہُوئے پھُول پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ رات جو کچھ دیکھا، وہ خواب نہ تھا، حقیقت تھی۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر سبز گھاس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور اپنے راستے پر ہو لیے۔ دُور اُفق کے قریب سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹونی نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ ہی ہماری منزل۔"

میری نگاہیں اُس کے چپکے ہُوئے کالے سیاہ بازو پر مرکوز ہو گئیں۔ عجیب و غریب مادّے کی تہہ جسے ٹونی نے ریت اور مٹی کا نام دیا تھا اب پہلے سے زیادہ دبیز ہو چکی تھی۔ مَیں نے دیکھا اس کی ٹانگوں اور گردن پر بھی اسی طرح کی ایک موٹی تہہ جمی ہُوئی ہے۔ گھبرا کر اپنے آپ پر نظر ڈالی تو میرا بھی یہی حال تھا۔ میں نے دیوانہ وار کھُرچ کر اُسے اُتارنا چاہا مگر بے سُود۔ عجیب و غریب مادّہ سیمنٹ کی طرح میرے جسم پر چپکا ہُوا تھا۔ مَیں نے چیخ کر ٹونی کا بازو تھام لیا اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "ٹونی! تمہاری آنکھوں کی بے یقینی کہتی ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ بولو ٹونی! بتاؤ کیا یہ واقعی ریت اور مٹی ہے...؟"

ٹونی لمحہ بھر کے لیے خاموشی سے کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: "گھبراؤ نہیں لڑکے! مَیں خود اصل حقیقت سے آگاہ نہیں۔ تاہم میرا خیال ہے، سُورج کی تپش سے ہمارے جسم کوئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ اور یہی حالت رہی تو شاید ہمارا وُجود کوئلہ بن کر بے جان مجسّموں کا رُوپ دھار لے۔ لڑکے! تیز چلو۔ ہم اس ملعون سرزمین پر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

آخر کار ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہم نے اُوپر چڑھنا شروع کیا۔ یہ خاصا دشوار اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ چند قدم اُٹھانے کے بعد ہانپنے لگتے۔ افتاں و خیزاں اُوپر پہنچے تو پھر اپنی کچھ خبر نہ رہی۔ بے سُدھ ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو اچانک ٹونی کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی: "لڑکے! او لڑکے! جلدی آؤ۔" مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

ٹونی چار پانچ گز دُور ایک گڑھے میں ٹیک لگائے کھڑا پہاڑ کی دُوسری طرف اشارہ کر کے چیخ رہا تھا: "وہ دیکھو، دُور سامنے کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ فضا میں بل کھاتا دُھواں ہمیں نئی زندگی کی خوشخبری سُنا رہا ہے۔ مبارک ہو لڑکے! اب ہم زندہ رہیں گے۔"

اندھیرے میں پہاڑ سے نیچے اُترنا خطرناک تھا۔ رات مجبوراً وہیں بسر کرنی پڑی۔ صبح سویرے چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے لیکن ابھی چند سو فٹ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک گڑگڑاہٹ اور دھماکوں سے پہاڑ لرز اُٹھا اور چاروں طرف بھونچال سا آگیا۔ ٹونی جس چٹّان سے چمٹا کھڑا تھا وہ یکایک فضا میں بلند ہُوا جیسے کسی نادیدہ قوّت نے اُوپر اُچھال لیا ہو۔ اُس کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ چٹّان کے ساتھ فضا میں اُڑتا ہُوا شیطانی سرزمین کی طرف جا گرا۔ ٹونی کے اس حسرت ناک انجام پر دل خُون ہو گیا لیکن آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ بے چارہ ٹونی، میرا محسن، میرا دوست! شیطانی سرزمین نے آخر اُس کے خُون کی بھینٹ لے ہی لی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور گڑگڑاہٹ اور شور کی آوازیں دُور ہوتی چلی گئیں۔

بعد کے واقعات میرے ذہن میں بہت دھُندلے ہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کب طُوفان تھما اور مَیں پہاڑ سے اُتر کر کس طرح گرتا پڑتا آخری آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہُوا۔ البتّہ بستی والے کہتے ہیں، مَیں بستی کے قریب بے ہوش پڑا تھا۔ وہ مجھے اُٹھا کر یہاں لے آئے جہاں پندرہ دن بعد مَیں نے آنکھ کھولی۔ بستی کے بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا، مَیں خوش قسمت بچّہ ہُوں جو شیطانی سرزمین سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ پہاڑ کے اُس طرف سے اب تک کوئی شخص زندہ واپس نہیں آیا۔ ◼◼

ایک صاحب نے شادی کے خلاف کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے پُرزور دلائل سے ثابت کیا: "شادی اس دَور میں سب سے بڑی لعنت ہے۔" مصنّف کے ایک قریبی دوست نے پُوچھا: "اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"یہ کتاب خُوب بِکے گی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی اُس سے پھر مَیں اپنی شادی کر سکوں گا۔" مصنّف نے جواب دیا۔